فارسی کلام سے حکیمانہ اشعار کا انتخاب

اور

اُن کی مختصر شرح

غالبؔ کے فارسی کلام کی مقدار اس کے مجموعۂ اُردو سے بہت زیادہ ہے۔ غالبؔ کو اپنے فارسی کلام پر ناز اور یگانہ ناز تھا۔ اس کی کوشش اور تمنا تھی کہ اسے اہلِ زبان شعراء کی صفِ اوّل میں ممتاز جگہ حاصل ہو۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ کس طرح اپنی ترقی کی رفتار اس معیار پر پرکھتا رہتا تھا۔ ایک مقام پر پہنچ کر کہتا ہے کہ

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالبؔ
گر ترقی نہ کنی شیخ علی رامانی

لیکن غالبؔ کے کلام میں جو پرواز، وسعت اور ہمہ گیری ہے وہ شیخ علی حزیںؔ میں کہاں۔ شیخ علی کے ہاں ایک خاص رنگ کے تغزل کے سوا کیا رکھا ہے۔ لیکن سخن کا کوئی شعبہ نہیں جس میں غالبؔ نے کمال کا اظہار نہ کیا ہو۔ اس کی مثنویاں شعریت زبان اور مضامین کے لحاظ سے کسی فارسی گو کی مثنوی سے کم رتبہ نہیں

لیکن غالبؔ اُردو میں شعر کہے یا فارسی میں جو کچھ بھی ہوگا۔ آخر ایک ہی

دل و دماغ کی پیداوار ہوگا۔ لہٰذا باوجود اس کے کہ وہ متعدد مقامات پر نثر، نظم اور خطوط میں کہتا ہے کہ میری جدتِ طبع، پروازِ خیال اور ندرتِ افکار کا مطالعہ کرنا چاہو تو ریختہ کو نظر انداز کر کے میرا فارسی کلام دیکھو لیکن اُردو کے کلام میں بھی کثرت سے حکمت اور شعریت کے جواہر ریزے منتشر ہیں۔ غالبؔ کے زمانے میں اُردو زبان فارسی کے مقابلے میں بہت کم مایہ تھی۔ لیکن غالبؔ کو اس سے کوئی عظیم نقصان نہ پہنچ سکتا تھا۔ اسے کون روکتا تھا کہ شعر میں تین چوتھائی فارسی کے الفاظ اس کی ترکیبیں اور محاورات بے تکلف استعمال کرے چنانچہ اس نے ایسا کیا ہے۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
کہ اندازِ بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینہ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

اس قسم کے سیکڑوں اشعار اس کے اُردو دیوان میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے اردو ہی کے دیوان کو الہامی قرار دیا۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ غالبؔ اُردو کو فارسی کے مقابلے میں بحیثیت زبان کم مایہ سمجھتا تھا۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ اسے اُردو شعراء میں کوئی خاص امتیازی مقام حاصل ہو۔ وہ نظیری اور عرفی، بیدلؔ اور ظہوری، کلیمؔ اور طالبؔ کی صف میں کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ فارسی میں ہزار برس کے ارتقاءِ فکری و لسانی نے لطیف افکار اور تاثرات کو ادا کرنے کے لیے لامتناہی خزینہ جمع کر لیا تھا۔ افکار و تاثرات حکیمانہ ہوں یا متصوفانہ عشقِ حقیقی ہو یا مجازی سب کے لیے سانچے بنے بنائے موجود تھے۔ اور اس میں ایسی لچک اور لوچ پیدا

ہو گیا تھا کہ نئی ترکیبیں آسانی سے ڈھل سکتی تھیں۔ اُردو لکھنے والا نثر لکھے یا نظم وہ فارسی ہی کی خوشہ چینی کرتا ہے۔ غالبؔ فارسی کی ثروت سے متاثر اور اس کا دلدادہ تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس زبان سے اسے فطری مناسبت ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر فارسی ہی سے اخذ کر کے اُردو کی آرائش اور زیبائش کرنا لازم ہے تو پھر سیدھی طرح فارسی ہی کو کیوں نہ اظہارِ خیال کا واسطہ بنا لیا جائے۔ داغؔ کا ہوس پرستی کا تغزل آسانی سے فارسی کی زیادہ آمیزش کے بغیر بھی اُردو میں اچھا خاصا نبھ سکتا ہے۔ لیکن غالبؔ جو گہری حکیمانہ باتیں کہنا چاہتا ہے اس کے لیے داغؔ کا سا اُردو کا روزمرہ کام نہیں آسکتا۔ اقبالؔ بھی غالبؔ ہی پر نظم لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ

گیسوئے اُردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی و سوزِ پروانہ ہے

دیکھیے اقبالؔ بھی اُردو کی حمایت میں شعر کہہ رہا ہے۔ لیکن شعر الفاظ اور تراکیب کے لحاظ سے فارسی کا شعر ہے۔ خود اقبالؔ نے اُردو سے منہ موڑ کر فارسی کا رُخ کیوں کیا؟ اس کا سبب بھی یہی تھا کہ غالبؔ کے بعد اقبالؔ ہی ایسا شاعر ہے۔ جس کے اندر غیر معمولی جدّتِ تفکّر اور شدّتِ تاثر اظہار کے لیے مضطرب ہے اس نے بھی محسوس کیا کہ بہ مقابلہ اُردو فارسی میں بلند اور گہری باتیں بیان کرنا آسان ہے۔ اقبالؔ کو فارسی زبان پر غالبؔ جیسی قدرت حاصل نہ تھی۔ اس کے باوجود اس زبان کی شعری استعداد اور اپنی ذاتی صلاحیت کی بدولت فارسی میں اقبالؔ وہ کچھ کہہ گیا ہے کہ متقدمین متاخرین اور معاصرین میں سے شاید دو چار اساتذہ سے زیادہ نہ نکلیں جو اس کے پہلو بہ پہلو بٹھائے جا سکیں۔ زبانیں کائنات کی ہر چیز کی طرح تدریجی ارتقار سے بنتی اور فروغ پاتی ہیں۔ اُردو کے ارتقاء کا زمانہ بہت

کم ہے۔ اس کے اندر بھی لامتناہی نشوونما کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ زمانہ دُور نہیں جب اُردو بشرطیکہ اسے ملّت اور حکومت کی وہ سرپرستی حاصل ہو جو اسے ابھی تک حاصل نہیں ہوئی، فارسی کی ہمسری کا دعویٰ کر سکیگی۔

ہم نے غالبؔ کے اُردو کلام کے انتخاب میں ایک سرے سے دُوسرے سرے تک جو اشعار حکمت سے لبریز معلوم ہوئے انھیں چُن کر معانی اور مطالب کسی قدر واضح کر دیے۔ فارسی میں بھی یہی انداز قائم رکھنا چاہیے۔ یہ شخص فکر و تصوّر کے بل پر زندگی کی تمام وادیوں میں آزادانہ گھومتا ہے۔ ایسے شخص کا کوئی خاص مشرب نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کے افکار کسی ایک نقشے کے ماتحت مرتب اور منظم ہی کیے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کا شاعر تضاد سے بھی نہیں گھبراتا۔ انسان کی طبیعت میں خود تضاد موجود ہے۔ فلسفہ افکار میں وحدت پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ دین اور فقہ میں بھی تنظیم کی کوشش پائی جاتی ہے۔ لیکن خواہشات تاثرات اور جذبات کی زندگی میں وحدت کہاں۔ شاعر خوش ہوتا ہے تو اسے ساری فطرت مسرّت سے لبریز نظر آتی ہے پریشان اور غم زدہ ہوتا ہے تو زندگی کا ہر پہلو تاریک دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کے خوش آئند پہلوؤں پر نظر جماتا ہے تو اسے خالقِ فطرت رحیم و حکیم معلوم ہوتا ہے۔ جہاں بے استحقاق اجر و زجر اس کے سامنے آتا ہے وہاں وہ شک کرنے لگتا ہے کہ کوئی خالق قادرِ مطلق اور سراپا رحمت ہے بھی یا نہیں۔ غالبؔ نے فارسی میں حمد کے طور پر لاجواب اشعار نکالے ہیں اور تصوف میں سموئی ہوئی ایسی چیزیں کہہ گیا ہے کہ رُومی، عطّار اور سنائی اس سے بہتر نہ کہہ سکیں۔ لیکن اسے صوفی کا وجدان اور ولی کا تجربہ حاصل نہیں۔ اور نہ

سیدھے سادے مسلمان کی طرح روایتی عقائد یا ایمان بالغیب ہی پر قانع ہے اس لیے مصیبت میں جلد پھسل جاتا ہے۔ ایک اردو خط میں اپنی یہ حالت بیان کرتا ہے کہ نہ شکر ہے اور نہ شکایت۔ لیکن اشعار کو الگ الگ دیکھیے تو کہیں بے انتہا شکر ہے اور کہیں کھلی کھلی شکایت۔ زندگی کی مصیبتوں کو دیکھ کر لوگ خدا کے منکر ہو جاتے ہیں۔ لیکن غالب حکیمانہ انداز میں حمد کا ایک لاجواب شعر کہتا ہے کہ یہ سچ ہے۔ دنیا میں دکھ درد اور رنج موجود ہے۔ فطرت اور خلقت میں اس پہلو کا ہونا لازم ہے۔ لیکن اس فطرت اور خالقِ فطرت کو کیوں برا کہیں جو دفعِ مرض اور رفعِ رنج کے اسباب مصیبت قبل مہیا کرتا ہے۔ تاکہ انسان حکمت اور ہمت سے شر کے پہلو پر غالب آجائے حیوان و انسان کی بیماریوں کے علاج میں جو دوائیں استعمال کی جاتی ہیں، وہ یا نباتی ہوتی ہیں یا جمادی۔ غالب میں ارتقائے حیات کے اشارے ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ نباتات اور جمادات کا وجود انسان اور حیوانات سے پہلے ظہور میں آیا اور اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ علاج بیماری سے قبل پیدا کیا گیا۔ یہ خالقِ فطرت کے رحیم ہونے کا ایک ثبوت ہے ؎

چارہ با سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازاں کیں در رسد آں را مہیا ساختی

لیکن یہی غالب جب مصیبتوں سے مغلوب ہوتا ہے۔ تو پکار اٹھتا ہے ؎

زندگی اپنی جو اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ایک جگہ کہتا ہے کہ کوئی آقا اپنے بندوں پر تو ایسی سختی روا نہیں

رکھ سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا مجھے اپنا بندہ نہیں سمجھتا۔ ہم نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو اس کا بندہ سمجھ لیا ہے۔ وہ ہماری بندگی تسلیم نہیں کرتا۔ اور ہم یونہی اس کے بندے بنے پھرتے ہیں ؎

با بندۂ خود ایں ہمہ سختی نمی رسد
خود را بہ زور بر تو مگر بستہ ایم ما

کبھی روپیہ نہیں ملتا تو گستاخی پر اتر آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ خدا کہاں ہے جو میری ضرورتوں کو نہیں دیکھتا۔ لیکن شاید یہ بات ہے کہ جانتا بھی ہے اور رحم بھی کھاتا ہے لیکن خود اس کے پاس دینے کو روپیہ نہیں۔ ؎

یارب تو کجائی کہ بما زر ندہی
بے رحم خدائی کہ بما زر ندہی
تے نے نہ تو غائبی و نے بے رحمی
بے مایہ چو مائی کہ بما زر ندہی

غالب جیسے شاعر میں وحدتِ فکر کی تلاش لاحاصل معلوم ہوتی ہے فکر میں پرواز ہے بلندی ہے گہرائی ہے نظر حکیمانہ ہے۔ مشرب آزادہ روی ہے۔ ادنیٰ خواہشات سے بلند ترین آرزوؤں تک طبیعت میں موجزن ہیں لیکن آرزوؤں کے اس ہیولے میں سے فکر، ارادے اور سیرت کی کوئی منظم کائنات نہیں بنتی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

جب آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں تو ترکِ آرزو کی تمنا کرتا ہے۔

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

پھر کسی اور کیفیت میں زندگی کا جائزہ لیتا ہوا دیکھتا ہے کہ ساری زندگی آرزوؤں ہی کی پیداوار ہے تو یہ فصیحت کرنے لگتا ہے کہ ؎

قدم نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

زندگی کے متعلق ہر قسم کا خیال اس کے ذہن میں گزرتا ہے۔ اور مختلف اقسام کے تاثرات پیدا ہو کر لطیف اشعار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ غالب کے ہاں نہ فن برائے فن ہے اور نہ فن برائے حیات۔ اس میں غیر معمولی ذہانت ہے اور غیر معمولی حساسیِ طبع۔ دل میں جو خیال گزرتا ہے اسے بے دریغ الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ باطن میں تاثر ہے اور ظاہر میں بیان۔ باطن میں تفکر ہے اور ظاہر میں اس کے اظہار کے لیے زبان۔ وہ کسی مذہب کا پیرو اور کسی مشرب کا بانی نہیں بس ایک

؎ شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

ہاں یہ ضرور ہے کہ وحدتِ وجود کے خاص نظریات کا غلبہ معلوم ہوتا ہے۔ جو ایک خاص قسم کا فلسفیانہ میلان ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بے شمار افکار اور اشعار ہیں جو خاص سرخیوں کے ماتحت نہیں لائے جا سکتے۔ پھر بھی کہیں کہیں خاص مضامین کے اشعار یک جا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

غالب کا ایک مضمون دیدہ وری یا بصیرت ہے۔

کہتا ہے کہ دیدہ ور یا صاحبِ نظر اسے کہتے ہیں جو زندگی کے ممکنات سے آگاہ ہو۔ فطرت جب کوئی چیز پیدا کر چکتی ہے اور کوئی مظہر معرضِ وجود میں آ چکتا ہے تو اس کے متعلق کچھ علم رکھنا یا اس کے صفات سے آگاہ ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن دیدہ وری یہ ہے کہ فطرت کے

ان ممکنات سے آگاہی ہو۔ جنھوں نے ابھی پیرایۂ وجود اختیار نہیں کیا۔ زندگی کی صلاحیتیں لامتناہی ہیں اور وہ صاحب بصیرت لوگوں ہی کو نظر آتی ہیں ظاہر بینی تو حیوان میں بھی پائی جاتی ہے۔ نفسِ انسانی کا کمال دروں بینی ہے۔ یہ دروں بینی فطرتِ خارجہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ جس کے ذریعے سے علم تسخیرِ فطرت کرتا ہے اور سائنس کے کمالات پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ بصیرت فنونِ لطیفہ میں کارفرما ہوتی ہے تو اعلیٰ درجے کا فن پیدا ہوتا ہے۔ اخلاقیات اور روحانیات میں بروئے کار آئے تو ولایت اور نبوت کی صنعت بن جاتی ہے۔ سنگ ناتراشیدہ میں خوبصورت بت فن کار کی بصیرت ہی کو نظر آتے ہیں

؎ دیدہ ور آں کہ تا نہد دل بشمار و بہری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

اس مضمون کو غالب نے قصیدۂ بست و ششم (۲۶) کی تشبیب میں دل کھول کر بیان کیا ہے ؎

رہروان چوں گہر آبلۂ پا بینند
پائے را پایہ فراتر ز ثریا بینند

ارتقائے حیات کا راستہ چلنے والے جب دیکھتے ہیں کہ تگ و دو سے ان کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں تو یہ آبلے انھیں آسمان کے ستاروں سے زیادہ تابندہ اور منور دکھائی دیتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ جد و جہد انھیں معراجِ حقیقت کی طرف لے جائے گی۔ انسان کی صحیح کوششوں کے مقابلے میں اجرامِ فلکیہ کی گردش اور ان کی تابندگی کیا حقیقت رکھتی ہے۔ ایسے دور بین اور باطن شناس ظاہر پر بھی نظر رکھتے ہیں اور باطن پر بھی اور وہ جانتے ہیں کہ فطرت میں ہر ظاہر کا ایک باطن ہے اور اس باطن کا ایک اور باطن

جو کچھ انسان کے نفس یا فطرت خارجہ میں ابھی کتمِ اخفا میں ہے وہ ظاہری علامات ہی سے اس کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ؎

ہر چہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند
ہر چہ در سینہ نہانست زسیما بینند!

سائنس دان کی علمی بصیرت ہو یا ولی اور نبی کی روحانی بصیرت جب اس سے فطرت کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو خواہ وہ فطرت انفسی ہو یا آفاقی اس میں ہر مظہر قواعد و ضوابط کے ماتحت نظر آتا ہے کوئی واقعہ محض اتفاقی نہیں ہوتا۔ علت و معلول کا سلسلہ ہر جگہ موجود ہے۔ عالم فطرت عالم اسباب ہے۔ اور خدا مسبب الاسباب فطرت اور خلقت میں کوئی تبدیلی مقررہ قوانین کے عمل سے خارج نہیں ہوتی۔ انسان کو اپنی زندگی کے حوادث اور فطرت کے حوادث میں بے ربطی اور کجی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ خیال تنگ نظری سے پیدا ہوتا ہے۔ فطرت کے قوانین میں ایک غیر متزلزل راستی پائی جاتی ہے:۔

لاتبدیل لخلق اللہ۔ لن تجد لسنت اللہ تبدیلا۔ لن تجد لسنتِ اللہ تحویلا

قرآن کریم میں بصیرت روحانی کے بیان میں ایک لاجواب آیت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ فطرت پر ایک نظر دوڑاؤ اور دیکھو اس میں کہیں کوئی خلیج شکست یا بے ربطی نظر آتی ہے۔ تمہاری نظر تھک کر حیران اور شکست خوردہ لوٹ آئے گی۔ لیکن یہ کہیں نظر نہ آئے گا۔ کہ قانون کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔

یہی مضمون اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

راستی از رقمِ صفحۂ ہستی خوانند نقشِ کج بر ورقِ شہپرِ عنقا بینند

حافظ کے ہاں بھی یہ مضمون ملتا ہے۔

پیرِ ما گفت خطا از قلمِ صنع نرفت

یہ خیال کہ ساری ہستی تابع فرمان اور تابع قانون ہے غالب کے ایک اور شعر میں بھی ملتا ہے۔ ؎

گر چرخِ فلک گردی سر بر خطِ فرماں نہ
در کوئے زمیں باشی وقفِ خمِ چوگاں شو

جو ادنیٰ حقائق اہلِ بصیرت پر منکشف ہوتے ہیں ان کے مظاہر انفس اس عالم میں بھی نظر آتے ہیں۔ عالمِ حقیقت عالمِ مجاز سے بے تعلق نہیں۔ لیکن چشم بدبین اور قلب کوتاہ اندیش کو یہ ربط نظر نہیں آتا۔

؎ دور بینانِ ازل کوریٔ چشم بد بیں!
ہم دریں جا نگرند آنچہ در آنجا بینند

بعض بلند پایہ حکما اور صوفیہ کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کائنات میں کوئی شے بے جان نہیں۔ عموماً موجودات کی تقسیم جمادات، نباتات اور حیوانات میں کی جاتی ہے۔ طبیعی سائنس ہو یا عام فکرِ انسانی جماد کو بے جان سمجھتے ہیں۔ غالب نے متعدد اشعار میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کوئی ذرہ بے جان نہیں ذرہ ہو یا آفتاب سب میں زندگی کا اضطراب ہے۔ اس خیال کی تائید قرآن کریم سے بھی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ زمین و آسمان دنیا و مافیہا میں کوئی شے ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح میں مشغول نہ ہو لیکن انسان اس تسبیح کا انداز نہیں سمجھ سکتا۔ تسبیح کے لیے کسی قسم کی زندگی کی ضرورت ہے۔ عارف رومی بھی جمادات میں زندگی کے قائل ہیں۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند با من و تو مردہ با حق زندہ اند

میر درد کی صوفیانہ شاعری میں بھی یہ لطیف شعر ملتا ہے

آہستہ سے چل میانِ کہسار ہر سنگ و کانِ شیشہ گر ہے

غالب کہتا ہے

از مہر تا بہ ذرہ دل جو دل ہے آئنہ!
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

عارف رومی کے دیوان کے ایک شعر میں بھی یہ عقیدہ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ کائنات ارواح کے آئینوں پر مشتمل ہے اور یہ جو طبیعی یا مادی نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آئینے کا ایک رو ہوتا ہے اور ایک پشت ان آئینوں کی لامتناہی پشتیں ہمارے حسی ادراک میں آتی ہیں۔ کیونکہ ہر روح کا چہرہ اپنی جانب ہے۔ اور پشت دوسری ارواح کی جانب۔ خالق کائنات کی زبانی یہ بیان کیا گیا ہے کہ

؎ آئینہ کردم عیاں رُویش دل و پشتش جہاں

مغرب کے اکابر حکما میں سے لائبنز نے اپنا پورا فلسفۂ حیات و کائنات اسی خیال کی اساس پر تعمیر کیا ہے۔ اس کی کتاب مونوڈولوجی اسی نظریے کی تشریح ہے۔ زمانۂ حال میں علامہ اقبال نے اپنے انگریزی فلسفیانہ خطبات میں اسی عقیدے کی حمایت کی ہے۔ کہ خدائے خالق ایک انائے مطلق یا ایغو ہے۔ خدا کے نفس کلی سے جو مخلوقات ظہور میں آتی ہے وہ بھی نفوس پر مشتمل ہے۔ جمادی مادہ ایک ثانوی حقیقت ہے۔ غالب کا ایک اور شعر ہے

ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
دیدۂ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

کیا لاجواب تشبیہ ہے۔ جدید ترین سائنس نے ذرے کا دل چیر کر دیکھا

تو وہ ایک قلبِ مضطرب نظر آیا۔ جس کا اضطراب کسی ریاضیاتی یا میکانکی قانون کی گرفت سے باہر ہے یہی اضطراب فاش ہو کر کائنات کو تہ و بالا کر سکتا ہے ذرات کی زندگی کے متعلق غالب کا ایک اور بلند پایہ شعر ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے کہ صحرا کے تمام ذروں کا رُخ خدا کی جانب ہے اور یہ ذرہ شوقِ قربِ الٰہی میں طریقت کا راستہ طے کر رہا ہے۔ اگر کسی میں یہ دیکھنے کی بصیرت ہو کہ کائنات کے ذرات کا رُخ کس منزلِ مقصود کی طرف ہے تو اسے کسی اور رہبر کی ضرورت نہ رہے۔ آفاق کا عارفانہ مطالعہ یہ حقیقت منکشف کر دے گا کہ آفاق و انفس میں فقط ظاہر اور باطن ہی کا فرق ہے۔ ہو الظاہر ہو الباطن ؎

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز برہِ تو روئے نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری!

دیدہ وری کے زیر شرح اشعار میں یہ شعر بھی عقیدہ بیان کرتا ہے

؎ راز زیں دیدہ وراں جوئے کہ از دیدہ وری
نقطہ گرد و نظر آرند سویدا بینند

اگر حیات و کائنات کا راز معلوم کرنا چاہو تو انھیں صاحبانِ بصیرت سے پوچھو جو موجودات کے ہر نقطے کو سویدائے قلب کا نقطہ سمجھتے ہیں۔ ہر ذرے اور ہر نقطے کا مرکزِ حیات ایک دل ہے۔ نفس اور اس کا معروض دونوں نفسی ہیں کائنات کے تمام راستوں پر نفوس ہی نفوس بچھے ہوئے ہیں یعنی ہر جادہ خود جادہ پیما اور ہر ساحل خود دریائے موجزن ہے۔ یہ اضطراب یہ گرم روی ہر جگہ موجود ہے۔ خواہ اجرامِ فلکیہ ہوں خواہ اجسامِ ارضیہ سیارے ہوں۔ یا سیاروں کے مدار کائنات ہر جگہ سراپا حرکت ہے اور یہ حرکت بے مقصود نہیں۔ زندگی کا ہر راستہ نبض کی طرح تڑپ رہا ہے

؎ راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی
جادہ چوں نبض نہاں در رگِ صحرا بینند!

سنگ بے آہنگ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ بالقوۃ شرارِ حرارت سے لبریز ہے۔ جس طرح زخمۂ تارِ ساز سے نغمے نکالتا ہے۔ اسی طرح پتھر سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ دیدہ وری یہ ہے کہ انسان سنگ کو بھی جامد و ثابت نہ سمجھے۔ جدید سائنس نے اسی دیدہ وری سے فطرتِ خارجی کا علم حاصل کرکے اس کی تسخیر کی ہے ؎

شررے را کہ بناگاہ بدر خواہد جست
زخمہ کردار بتارِ رگِ خارا بینند

دریا کا ہر قطرہ بالقوۃ گوہر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چہرۂ دریا پر جو آبلہ ہائے حباب ہیں۔ صاحبِ نظران کے ممکنات جانتا ہے ؎

قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست
صورتِ آبلہ بر چہرۂ دریا بینند

حباب و آبلہ سے غالب کا ایک اور حکیمانہ شعر یاد آگیا جو اس کی فارسی کی ایک بلند پایہ صوفیانہ غزل میں ہے۔ ذاتِ الٰہی جو ایک گوہرِ نایاب ہے اس کی تلاش میں دریا اس طرح گرم رو ہے کہ اس کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ حالانکہ وہ گوہرِ نایاب اس دریا کی اپنی ہی گہرائیوں میں موجود ہے

؎ دریا ز حباب آبلہ پائے طلب تست
نورِ نظرا اے گوہرِ نایاب کجائی

ساتھ ہی ایک دوسرا لطیف شعر ہے۔ انسان کے تارِ نفس سے طرح طرح کے نغمے اور نالے نکل رہے ہیں۔ لیکن نہ ساز نظر آتا ہے

اور نہ اس کے مضراب کی جنبش۔ زندگی کا یہ ساز بے آواز بھی بجتا ہے اور باآواز بھی۔ لیکن انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ خود ساز نواز نہیں، مطرب کائنات نظر نہیں آتا۔ ؎

شوریست تو اریزی تارِ نفسم را
پیدا نہ اے جنبشِ مضراب کجائی

مظاہرِ فطرت میں ہر علت کے اندر اس کا معلول مضمر ہوتا ہے۔ علت کو دیکھ کر معلول کے متعلق نتیجہ نکالنا یا مقدم پر نظر کرکے موخر کو پہلے ہی دریافت کرنا علم و حکمت و عرفان میں اسی کا نام دیدہ وری ہے۔

عالمِ اضداد میں ایک پہلو دیکھ کر دوسرے پہلو کی طرف ذہن کا منتبادر ہونا ممکن کو موجود تصور کرنا ستارۂ صبح میں شام کو اور چمگادڑ کی نگاہ میں دن کو نمایاں طور پر دیکھنا بصیرت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

؎ شام در کوکبۂ صبح نمایاں نگرند
روز در منظرِ خفاش ہویدا بینند

عجم کے تاثرات ہوں یا عرب کے جذبات۔ فرہاد و شیریں و خسرو کا افسانہ ہو یا وامق و عذرا کی داستان۔ دیدہ ور اختلافِ مذہب و ملت میں بھی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے ؎

ہر چہ گوید عجم از خسرو و شیریں شنوند
ہر چہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

دیدہ ور عشق کے جذبے سے خالی نہیں ہوتا۔ دیدہ وری اور عشق ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں لیکن بے بصیرت اہل ہوس یا عاشق اور دیدہ ور محبت کیش میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مجنوں لیلیٰ کے عشق میں عقل و حواس اور توازنِ حیات

کھو دیتا ہے اور اپنے جذبے پر قابو پانے کے بجائے اس سے مغلوب ہو جاتا ہے معشوق کے فراق میں آہ و زاری کرنے لگتا ہے۔ اور اگر محمل لیلیٰ نظر آ جائے تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے لیکن دیدہ ور عاشق میں صحو سُکر پر غالب ہوتا ہے۔ اس میں ہائے وہو اور ظاہری جوش و خروش نہیں ہوتا۔ عشق کی آگ شعلہ زن ہو کر اسے خاکستر نہیں کر دیتی بلکہ اس کی گرمی نفس و بدن کے رگ و پے میں سرایت کر کے حیات آفرینی کرتی ہے۔

ے نہ سننوہند اگر ہمرہِ مجنوں گردند
نخروشند اگر محملِ لیلیٰ بینند!

دیدہ ور کے شمائل میں ایک صفتِ ستودہ یہ بھی ہے کہ جو نعمت جسمانی یا روحانی اسے میسّر ہے۔ وہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔ اگر کسی مجبوری سے ایسا نہ کر سکے تو وہ نہایت مضطرب ہوتا ہے۔ انبیاؑ میں یہ بات بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے۔ دیدہ ور دن رات اعمال و عبادات میں اسی انداز سے مصروفِ جد و جہد رہتا ہے۔ کہ دوسروں کو اپنی روحانی نعمت میں شریک کرے۔ زندگی کے خوانِ نعمت پر وہ تنہا خوری نہیں کرنا چاہتا

ے خوں خورند و جگر از غصہ بدنداں گیرند
خویش را چوں بسر مائدہ تنہا بینند

ایسی حالت میں قطرۂ آب اپنے مُنہ میں ٹپکانا دہن پر نشتر زنی محسوس ہوتا ہے۔ اور پارۂ نان ریزۂ مینا کی طرح گلو خراش ہو جاتا ہے۔

ے قطرۂ آب بلب بوسۂ نشتر شمرند
پارۂ ناں بگلو ریزۂ مینا بینند

ایک اور خصوصیت دیدہ ور میں یہ ہوتی ہے کہ وہ دُوسری ملتوں کو اختلافِ

شعائر و شرائع کے باعث نفرت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے۔ وہ جانتا ہے کہ قوموں کے عادات و رسوم ایک طرح کے نہیں ہو سکتے۔ فطرت تنوع پسند ہے۔ اگر ہندو ماتھے پر قشقہ لگاتا ہے تو کیا اور زنار باندھتا ہے تو یہ اس کا ایک قومی شعار ہے۔ پارسی اپنی عبادت میں برسم کی لکڑیاں جلاتا ہے اور اس کی عبادت زمزمہ ہے۔ عیسائی شراب کو حرام نہیں سمجھتا اور اسے عبادت میں بھی استعمال کرتا ہے گلے میں صلیب لٹکاتا ہے محض ان اختلافِ ظواہر کی بنا پر انھیں مردود، کافر اور نعمائے الٰہی سے محروم نہیں سمجھ سکتے۔ خزانۂ غیب سے گبر و ترسا سب کو وظیفہ ملتا ہے۔ خرقہ و تسبیح و مسواک و مصلاّ والے عبادت گزار مومن کو چاہیے کہ دوسروں سے بھی رواداری برتے دین میں کوئی اکراہ نہیں۔

ظواہر کی کسی چیز میں وہ اپنا دل نہیں اٹکاتے۔ نیرنگِ حیات میں زندگی کی گوناگونی کا تماشا کرتے ہیں۔ انسان کے اندر جس قدر بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اسی قدر اس میں رواداری کا جذبہ ترقی کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیدہ ور کا کوئی مخصوص مشرب اور جادۂ عمل نہیں ہوتا۔ جس چیز کو وہ حقیقت سمجھتا ہے۔ اس پر قائم اور ثابت قدم ہوتا ہے۔ لیکن اختلافِ رنگ و اختلافِ ملّت کی بنا پر رحمتِ عامہ سے کنارہ کش نہیں ہوتا خدا نے ساری مخلوق کو یک رنگ نہیں بنایا اور نہ وہ چاہتا ہی ہے کہ تمام انسانوں کو جبراً شعائر کے لحاظ سے ایک ہی خم میں غوطہ دے ے

قشقہ را رونق ہنگامۂ ہندو خوانند
باده را شمع طرب خانۂ ترسا بینند

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب
خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلا بینند

دل نہ بندند بہ نیرنگ در ایں دیر دو رنگ
ہر چہ بینند بہ عنوانِ تماشا بینند

جو الٰہی اور ازلی حقیقت مکانی نہیں اور زمان و مکان جس کے عارضی سانچے ہیں اس لیس کمثلہ شئیٌ کو وہ ہر شے میں دیکھتے ہیں ؎

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

؎ ہر چہ در سو نتواں یافت بہ ہر سو یابند
ہر چہ در جا نتواں دید بہ ہر جا بینند

دیدہ ور کی بصیرت یہ ہے کہ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے خدا شناسی کے باعث وہ حقیقت کلی سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور یہ انفصال اس درجے کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ خود 'بے ہمہ' ہونے کے ساتھ 'با ہمہ' ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس بصیرت سے ان میں کوئی غرور پیدا نہیں ہوتا۔ اپنی انفرادیت پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ انھیں ہیچ معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان میں انکسار موجود رہتا ہے۔ ؎

ہمہ گردن فرازاں پایہ کہ او را دانند
ہیچ باشند در آں وقت کہ خود را بینند

غالبؔ کے ہاں دیگر فارسی شعرا کی طرح کثرت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو محض تعلّی اور تفاخر کے تحت میں آسکتے ہیں جس شخص کو واقعی کوئی کمال حاصل ہوتا ہے اسے اس کمال کا احساس ہوتا ہے۔ غالبؔ کو بھی تلمیذ الرحمٰن ہونے کا قوی یقین ہے وہ کئی جگہ کہتا ہے کہ شاعری میں نے قصداً اختیار نہیں کی۔

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

شاعری کی بہت سی قسمیں ہیں اکثر شاعر محض صنّاع ہوتے ہیں۔ خالی شعری صنعت بھی دوسری صنعتوں کی طرح اپنے اندر ایک دلکشی رکھتی ہے۔ دیکھیے

ذوقؔ کو فطرت نے شاعر نہ بنایا تھا۔ لیکن وہ اعلیٰ درجے کا صنّاع تھا۔ اس کی صنّاعی میں آورد پر آمد کا دھوکا ہوتا ہے۔ محض صنّاعی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو زبان اور بندش، محاورے اور روزمرّہ کے لحاظ سے ذوقؔ کا دیوان غالبؔ کے اردو دیوان سے افضل معلوم ہوگا۔ لیکن ذوقؔ کا شاید ہی کوئی ایسا شعر ہو جس کے متعلق کہ سکیں کہ یہ قلب کی گہرائیوں سے نکلا ہے یا الہامی ہے یا انسان کے لطیف جذبات کی ترجمانی ہے یا

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم !
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

لیکن غالبؔ کے ہاں اس قسم کی شاعری کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں گہرے حکیمانہ افکار متصوفانہ اشعار فطرت انسانی کی آئینہ داری۔ ہوس اور عشق کی کشمکش زہد اور رندی کی پیکار، خواہشات کا تصادم، بلند نصب العین کی کشش اور دلاویزی اس کے مقابلے میں عمل کی پستی ان سب چیزوں کا اظہار اور اقرار اس کی شاعری میں ایک حقیقت پیدا کر دیتا ہے اور جب حقیقت کے بیان میں سوزِ دل موجود ہو تو شعریت کو معراج حاصل ہو جاتی ہے۔

غالبؔ نے اپنی شاعری کو خودرو گل و ثمر سے تشبیہ دی ہے جس کی باغبانی خود فطرت کرتی ہے۔ کلیات فارسی کے دیباچے میں وہ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ یہ کمال کہاں سے آیا اس کا ماخذ وہی ہے اگرچہ ہر فن کی تکمیل کے لیے انتساب بھی لازم ہے۔

لای خم مے خانۂ سرمدی نسبت نا چشیدگاں سگالند کہ ہیچمدانے را ایں مایہ سیرابیٔ نطق از کجاست۔ نہال کہ نم رشحۂ یک فیض است کہ سبزہ را دمیدن و نہال را سر کشیدن و میوہ را رسیدن و لب را زمزمہ آفریدن آموخت بہ پرتو

مہتابِ ازلی ہدایت نشگیر نگردگاں اندیشند کہ تیرہ انجامے را ایں ہمہ روشنائی گفتار چراست۔ بیخبر کہ فرہ تابش یک نورست کہ شمع را بہ شعلہ و قدح را بہ بادہ و گل را برنگ و درون را بہ سخن برافروخت ؎

رشحِ کفِ جم می چکد از مغزِ سفالم
سیرابی نطقم اثرِ فیضِ حکیم است

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشان است
می و میخانہ با مہر و نشان است

جو لوگ ازلی حقائق کو سرچشمۂ حیات سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور اس میخانۂ سرمدی کی تلچھٹ سے بھی نا آشنا ہیں وہ حیران ہوتے ہیں کہ اس ہیچ مدان علوم و فنون سے بے بہرہ شخص کے نطق کو کہاں سے سیرابی حاصل ہو گئی وہ اس حقیقت سے غافل ہیں کہ فیضِ ازلی جو سبزہ اگاتا، درخت سربلند کرتا اور ثمر پکاتا ہے۔ وہی بعض طبائع میں زمزمہ بھی پیدا کرتا ہے۔ جنھیں یہ علم نہیں کہ بعض لوگ مہتابِ ازلی کے پرتو سے کس طرح شبِ ظلمت میں ہدایت پا کر راستہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ ششدر رہ جاتے ہیں کہ اس بدعمل اور تیرہ انجام شخص کو یہ روشنئ گفتار کہاں سے مل گئی وہ اس صداقت سے بے خبر ہیں کہ ایک ہی نورِ ازلی ہے جو اپنے فیضان سے شمع کو شعلہ قدح کو بادہ پھول کو رنگ اور شاعر کے باطن کو سخن سے روشن کر دیتا ہے۔ ؎

مسنج شوکتِ عرفی کہ بود شیرازی
مشو اسیرِ زلالی کہ بود خوانساری
بسومناتِ خیالم در آی تا بینی !   رواں فروز برو دوش ہائے زناری

کہتا ہے کہ اس فیضانِ ازلی کے لیے شیرازی اور خوانساری ہونا لازم نہیں اپنے کلام کو سومناتِ خیال کہتا ہے کہ یہ فیض اہلِ زبان نہ ہونے پر بھی ایک ہندی نژاد شاعر کو حاصل ہوا۔ فطرت نے مجھے شاعر بنایا ہے اور میں اعلیٰ درجے کا شاعر ہوں اور کسی کمال کا مدعی نہیں اپنے عقیدے کے لحاظ سے کسی دوسرے کا افسون مجھ پر نہیں چل سکتا میں ناصح اور واعظ نہیں کہ وعظ و نصیحت سے ایک دنیا کو خداشناس بنا سکوں نہ مجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ مورخانہ بصیرت سے پرانے قصوں کو دیو افسانے (مائتھولوجی) سمجھ لوں نہ میں یہ کر سکتا ہوں کہ مشہور آثار سے کوئی نئے نتیجے نکال سکوں۔ میں یہ زہد ورزی بھی نہیں کر سکتا کہ اجرِ زہد میں بہشتی لباس حاصل کرنے کی امید پر یہاں اچھا لباس پہننا چھوڑ دوں ساتھ ہی فراخ روی، آزادی اور وسیع المشربی میں مجھے ٹاٹ پہننے سے بھی کوئی عار نہیں نہ ساقی ہوں کہ دوسروں کو شراب پلانے کا پیشہ اختیار کروں اور نہ محتسب ہوں کہ دوسروں کے قدح و خم کو الٹنا اپنا فرض سمجھوں۔

نہ چنانم کہ بر عقیدۂ خویش   از فسونِ کسے ہراس کنم
نہ توانم کہ از نصیحت و وعظ   عالمے را خداشناس کنم
نہ کہ اخبارِ باستانے را   دیو افسانہا قیاس کنم
نہ کہ ز آثارِ ہر چہ مشہور است   اثرے تازہ اقتباس کنم
نہ کہ از بہر حلّہ ہائے بہشت   ترکِ آرائشِ لباس کنم
نہ کہ در عالمِ فراخ روی   عار از ژندۂ پلاس کنم
چوں نہ من ساقیم نہ محتسبم   نہ بر بزم نہ مے لباس کنم

ایک ترکیب بند میں جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام
شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام

بعض اشعار میں زور شور کی تعلی معلوم ہوتی ہے۔ اس قسم کے شعروں سے متعلق جائز طور پر یہ زاویۂ نگاہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اس میں غالب یہ بیان نہیں کر رہا میں یہ کچھ ہوں بلکہ جو کچھ وہ ہونا چاہتا ہے اس آرزو کا اظہار کر رہا ہے یا یوں کہیے کہ بلند انسانی نصب العین بیان کر رہا ہے کہ اگر کسی کو اعلیٰ درجے کی بصیرت اور دیدہ وری حاصل ہو تو وہ شخص کن صفات کا حامل ہو۔ جیسا کہ اپنی ایک اردو غزل میں کہتا ہے :۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے !
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے !
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

ان اشعار میں غالب اپنی واقعی سیرت کا نقشہ نہیں کھینچ رہا۔ وہ موجودات کے متعلق ایک خاص اندازِ نگاہ کا متمنی ہے۔

دوسرے بند میں دو شعر تو اسی مضمون کے ہیں جو اس کے نثر کے دیباچے میں ملتا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے لطافتِ طبع دوسروں سے حاصل نہیں ہوئی اور میں اپنے کمال میں دوسروں کا رہینِ منت نہیں۔ غیر معمولی فیضان کے لیے خارجی علل و اسباب ضروری نہیں ہوتے۔ دشت میں گل و سوسن کی باغبانی کون کرتا ہے اور غنچے کی قبا کوئی درزی نہیں سیتا۔ یہ مضمون انجیل میں حضرت مسیحؑ کی اس تلقین کے مماثل ہے جہاں وہ اپنے حواریوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ کھانے پہننے کے متعلق فکرِ فردا سے بے نیاز رہو۔ دیکھو کہ گل کو فطرت کی طرف سے وہ قبا ملتی ہے۔

جو حضرت سلیمانؑ کو اپنی عظمت و شان کے باوجود میسّر نہ تھی۔ ؎

لطفِ طبع از مبدءِ فیاض دارم نے ز غیر
دشت را خود رو بود گر سرخ گل در سوسن است
کار چوں نازک بود علت نگنجد در میاں !
غنچہ در تنگی قبائش بے نیاز از سوزن است

نابغہ روحانی ہو علمی ہو یا فنی اپنی باطنی قوتِ حیات سے خلاقی کرتا ہے ادنیٰ فطرتوں کو خارجی محرکات کی ضرورت ہوتی ہے جنھیں فطرت نے خلاق بنایا ہے میخانۂ حیات میں ان کا ساغرِ زندگی خود اپنی باطنی قوت سے حرکت کرتا ہے جیسا کہ جوِّ سما میں آفتاب اپنی ذاتی قوتوں سے گردش کر رہا ہے۔ کسی ساقی کے سامنے میرا سر نہیں جھکتا ؎

من کہ با ساقی ز والائی فرو ناید سرم
آفتاب آسا بزورِ خویش گردد ساغرم

دوسرے بند میں اس عالمِ زمان و مکان اور اس جہانِ سنگ و خشت کو ایک زندان قرار دیتا ہے ۔ الدنیا سجن للمومنین لیکن چشمِ بصیرت دیوارِ زندان کا روزن ہے۔ انسان کے معنی ہیں آنکھ کی پتلی۔ شیخ اکبر نے فصوص الحکم میں فصِ آدم میں یہ بیان کیا ہے کہ خدا کی ہستی الآن کما کان موجود تھی لیکن جب اس نے اپنے آپ کو دیکھنا چاہا تو آدم کو خلق کیا جس میں بصیرت نہیں وہ عالمِ آب و گل کا قیدی ہے۔ لیکن بصیرت سے انسان دہر آشنا ہو جاتا ہے۔ اور یہی آفاق شناسی نفس شناسی کے راستے سے خدا آگاہی بن جاتی ہے عام انسان طلسمِ محسوسات ہی کے اسیر رہتے ہیں اور انھیں اس اسیری کا احساس

تک نہیں ہوتا ؎

روشناسِ چرخ و رجمِ اسیرانش منم
نورِ چشمِ روزنِ دیوارِ زندانش منم
ثابت و سیار گردوں را رصد بستم بہ علم
رشتۂ تسبیحِ گوہرہائے غلطانش منم

یہ دوسرا شعر بھی انسان کے متعلق ہے۔ انسان نے سیاروں کی گردش اور اس کے حساب کو علم ہیئت سے سمجھا جو ریاضیات کی ایک شاخ ہے اب حکماء طبیعیات کہتے ہیں کہ سارے عالم طبیعی کو خواہ وہ ارضی ہو یا افلاکی ریاضی ہی کے اصولوں سے سمجھا جاتا ہے اور یہ ریاضی کے اصول نفسِ انسانی کے سانچے ہیں۔ عالم کی حقیقت وہ نہیں جو ریاضی کی گرفت میں آتی ہے۔ زمان و مکان کی حقیقت نفسی اور مجازی ہے۔ موجودات کی شیرازہ بندی جو ریاضیات سے حاصل ہوتی ہے۔ نفسِ انسانی ہی کا کرشمہ ہے۔ غالب کہتا ہے کہ تسبیحِ انجم کے یہ گہرہائے پریشاں علم انسانی کی بدولت قوانین کی لڑیوں میں پروئے جاتے ہیں

اس بند کے آخری شعر میں ایک اور لطیف مضمون ہے۔ بڑے بڑے صاحبِ عرفان لوگ عوام کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ دنیوی جاہ و منزلت والے خواہ وہ علم و حکمت اور بصیرت سے معرّا ہوں چشمِ ظاہر بین کو عظیم الشان انسان دکھائی دیتے ہیں عارف اور عالم کو لوگ کچھ نہیں سمجھتے وہ انھیں بہت حقیر معلوم ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بیان کرنے کے لیے غالب نے کیسی اچھوتی اور دلنشین مثال تلاش کی ہے۔ کہ جو ستارہ جتنا بلند ہوتا ہے وہ زمین والوں کو اتنا ہی چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ اجرامِ فلکیہ میں سے چاند ایک حقیر سا ٹکڑا ہے لیکن افلاک میں پست ترین اور زمین سے قریب ترین ہونے کی وجہ سے وہ بہ اعتبار

حجم سورج سے تھوڑا ہی چھوٹا دکھائی دیتا ہے جو اس سے کروڑوں گنا بڑا ہے خود سورج کے مقابلے میں بعض ستارے ہزاروں گنا زیادہ ضخامت رکھتے ہیں لیکن دوری کی وجہ سے قوی دوربینوں کی مدد کے بغیر دکھائی بھی نہیں دیتے ؎

پایۂ من جز بچشمِ من نہ آید در نظر
از بلندی اخترم روشن نہ آید در نظر